اسلامی نظام قضاء میں حجیت قرائن ایک تحقیقی جائزہ

Assessing The Legal Authority of Circumstantial Evidence in Islamic Jurisprudence: A Critical Review

Shahbaz Abbasi
PhD Scholar, Qurtuba University,
Science & Technology, Peshawar Campus
Dr Mushtaq Ahmad
Dean, Faculty of Social Sciences,
Qurtuba University, Peshawar Campus

Abstract
This research article examines the evidentiary status and legal significance of circumstantial evidence (Qarā'in) in the Islamic judicial system, particularly in relation to the establishment of claims (Ithbāt al-Da'wā). The study highlights the perspectives of classical and contemporary jurists regarding the admissibility and authority of traditional and modern forms of circumstantial evidence. It also discusses the role of forensic, documentary, and digital evidence within the framework of Islamic law. Furthermore, the article analyzes the effectiveness and persuasive value of Qarā'in through relevant examples, concluding that reliable circumstantial evidence plays a vital role in achieving justice and strengthening judicial decisions in accordance with the objectives of Sharī'ah.

Keywords: Islamic Judicial System, Qarā'in (Circumstantial Evidence), Ithbāt al-Da'wā, Islamic Law, Evidence in Sharī'ah, Judicial Proof, Forensic Evidence

شریعت مطہرہ نے انسانیت کو ایک ایسا جامع، مؤثر اور متوازن نظام حیات عطا کیا جس کی بنا پر نہ صرف اصلاح معاشرہ کو فروغ دیا جا سکتا ہے بلکہ ایک مثالی معاشرے کی تشکیل بھی ممکن ہے جسے خیر القرون کہا جاتا تھا۔ دین متین فقط قوانین اور چند ضابطوں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کے اہداف کا مرکزی نقطہ ایسے پاکیزہ معاشرے کا قیام ہے جہاں خیر، تقوی اور ہدایت کو فروغ حاصل ہو اور جرائم خود بخود ختم ہو جائیں۔ اسی باعث اسلام نے سادگی ، اعتدال اور اخلاقی پاکیزگی کی تعلیم دی بلکہ رسول اکرم ﷺ کی پوری حیات طیبہ سادگی، انکساری اور اعلیٰ اخلاق کا نمونہ ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں رسول خدا ﷺ کی تربیت کا عکس موجود تھا لہذا مسلمان متقی اور پرہیز گار تھے سو مسلمانوں کے درمیان جھگڑے نہ ہونے کے برابر تھے مگر اسلامی تعلیمات میں اختلافات کے منصفانہ

حل کا مکمل طریقہ کار موجود تھا۔ شریعت نے تنازعات کے تصفیے کے لیے عدلیہ منصب قضاء کو نہایت اہمیت دی ہے اور قاضی کو عدل و انصاف کے قیام کی سخت تاکید کی ہے اور دونوں متنازعے گروہوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو بھی واضح کیا ہے تاکہ دعویٰ سے لیکر فیصلے تک تمام عدالتی امور شفافیت کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ سکیں اور کسی بھی فریق کے ساتھ کسی بھی قسم کا ظلم ،زیادتی یا استحصال نہ ہو اس حوالے سے اسلام نے جو اصول اور ہدایات دی ہیں ان کی اصل عدل و انصاف کا قیام اور دونوں گروہوں کے حقوق کا تحفظ ہے ذیل میں ان امور کا ذکر کیا جائے گا جو کسی بھی دعویٰ اور اس کی سماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

دعویٰ: تعریف، شرائط اور شرعی اصول:

جب دو فریقوں کے درمیان کسی امر یا حق میں باہم نزاع پیدا ہو جائے تو اس کے تصفیے کے لیے معاملہ عدالت لے جایا جاتا ہے قانونی کاروائی کے دوران جو شخص اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے مدعی کہلاتا ہے اور جس شخص کے خلاف مطالبہ کیا جاتا ہے وہ مدعاعلیہ ہے۔ فقہ اسلامی میں دعویٰ تنازع کے تصفیے کا بنیادی ذریعہ ہے۔

دعویٰ لغت کی روشنی میں:

لسان العرب کے مطابق دعویٰ کا معنیٰ ہے۔

"وَالدَّعْوَى مَا يَدَّعِيهِ الْإِنْسَانُ مِنْ حَقٍّ عِنْدَ غَيْرِهِ، يَطْلُبُ إِثْبَاتَهُ عِنْدَ الْحَاكِمِ."[1]

ترجمہ: "دعویٰ وہ چیز ہے جس کا انسان کسی دوسرے کے ذمہ اپنے حق کے طور پر دعویٰ کرے، اور حاکم (قاضی) کے سامنے اس کے ثابت کیے جانے کا مطالبہ کرے۔"

فقہاء کے نزدیک دعویٰ:

مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے۔!

"وَالدَّعْوَى هِيَ طَلَبُ أَحَدٍ حَقَّهُ مِنْ آخَرَ فِي حُضُورِ الْقَاضِي."[2]

ترجمہ: "دعویٰ یہ ہے کہ کوئی شخص قاضی کی موجودگی میں دوسرے شخص سے اپنے حق کا مطالبہ کرے۔"

جب کوئی شخص اپنے حق کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے تو اس کے مطالبے کو دعویٰ کہا جاتا ہے۔

دعویٰ کے لازمی عناصر:

دعویٰ کے بنیادی چار عناصر ہیں۔

1۔ مدعی۔(دعویٰ کرنے والا)

2۔ مدعی علیہ۔(جس کے خلاف دعویٰ کیا جائے)

3۔ مدعا۔(دعویٰ کا مطالبہ)

4۔ مدعی بہ۔(جس شے /مال کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہو)

مدعی اپنے حق میں دلائل پیش کرتا ہے جبکہ مدعی علیہ اس کی تردید و دفاع میں اپنا قانونی حق استعمال کرتا ہے یوں منصفانہ فیصلے تک پہنچا جاتا ہے۔

فقہ اسلامی میں صحت دعویٰ کے بنیادی اصول:

اسلامی عدالتی نظام میں کسی بھی قانونی کاروائی کی بنیاد اور ابتدائی مرحلہ دعویٰ ہوتا ہے تاہم ہر دعویٰ قابل سماعت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے چند بنیادی شرائط کا پایا جانا لازم ہوتا ہے۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ نے دعویٰ کی صحت کے لیے پندرہ شرائط متعین کی ہیں جن کی مختصر وضاحت ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

"مدعی عاقل، بالغ اور قانونی طور پر دعویٰ کے دائر کرنے کا اہل ہو اور جس کے خلاف دعویٰ کیا جارہا ہو وہ بھی مخصوص، معلوم اور موجود ہو۔ اسی طرح مدعی بہ بھی معلوم، متعین ہو اور شریعت و قانون کے مطابق قابل مطالبہ بھی ہو اور دعویٰ میں بھی حقیقی تنازع ہو اسی طرح دعویٰ قاضی یا حاکم کے سامنے پیش کیا جائے اور دعویٰ کے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس کو صریح الفاظ میں پیش کیا جائے مبہم اور غیر واضح دعویٰ ناقابل سماعت ہوتا ہے جبکہ دعویٰ ایسا ہونا چاہیے جس پر شرعی و قانونی دلائل پیش کیے جاسکیں۔"1

مجلۃ الاحکام کی بیان کردہ شرائط کے مطابق فقط وہ دعوے معتبر شمار ہونگے جن میں کسی نتیجہ پر پہنچ سکے بلکہ ایسے تمام دعوے جو مقررہ حدود و قیود کے ساتھ نہ ہوں باطل قرار پائیں گے۔

ثبوت دعویٰ کا معیار:

اسلامی شریعت میں کسی بھی فرد کے دعویٰ کو درجہ تصدیق تک پہنچانے کے لیے چار معتبر ذرائع مقرر کیے گئے ہیں جن کی بنیاد پر عدالت فیصلہ صادر کرتی ہے۔

1۔ اعتراف

2۔ گواہی

3۔ حلف

4۔ امارات / قرائن

اسلامی عدالتی نظام میں جب مدعی قانونی کاروائی کرتا ہے تو اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس پر مستند اور معتبر شواہد پیش کرے جو اسے درست ثابت کرسکیں جبکہ مقابلے میں عدالت دوسرے کے سامنے اس کو پیش کر

کے اس کے انکار و اعتراف کی متقاضی ہوتی ہے اگر مقابل شخص اس کو تسلیم کرے تو یہ عدالتی کاروائی اعترافی بیان کے باعث نمٹ جاتی ہے لیکن اگر مخالف انکاری ہو تو پھر دیگر ذرائع کی بنیاد پر مقدمے کی کاروائی آگے بڑھائی جاتی ہے جن کا بیان آگے آرہا ہے۔

اعتراف:

علم فقہ میں جب کسی شخص کے خلاف عدالتی کاروائی کا آغاز ہو اور وہ عدالت میں بیان کردہ حقائق یا الزامات کو تسلیم کرلے تو یہ اقرار کے دونوں جہات(confesion,admission) کا احاطہ کرتا ہے۔ اقرار کی اہمیت کے شواہد قرآن میں بھی موجود ہیں۔

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ۔"(القرآن)2

ترجمہ:"اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ اللہ کے لیے گواہی دو چاہے اس میں تمہارا اپنا نقصان ہو"۔

فقہ اسلامی میں اعتراف کو انتہائی فیصلہ کن حثیت حاصل ہے چونکہ جب کوئی شخص خود پر لگے الزامات کا خود اعتراف کرلیتا ہے تو پھر اس کے بعد مزید کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی چونکہ یہ متاثرہ شخص کا اپنے خلاف براہ راست دیا گیا بیان ہوتا ہے۔ اقرار کی بھی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

1۔ عبادات سے متعلق اقرار کے احکام

2۔ معاملات سے متعلق اقرار کے احکام

اقرار کی قانونی و شرعی حثیت:

1۔ وہ فرد عقل و بلوغ کی شرائط پر پورا اترتا ہو اور اس پر کسی بھی نوعیت کی زبردستی نہ کی گئی ہو۔ حدیث مبارکہ میں ہے۔

"رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ، وَعَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَعْقِلَ، وَعَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ۔"5

"تین اشخاص سے قلم (یعنی شرعی تکلیف اور مؤاخذہ) اٹھالیا گیا ہے: بچے سے، مجنون سے، اور مجبور (مکرَہ) سے۔"

2۔ اگر کسی شخص کے پیش نظر اقرار کی صورت میں کسی بھی گروہ یا فرد کو کسی بھی قسم کا فائدہ پہنچانا مقصود ہو تو یہ اقرار مؤثر نہیں ہوگا اس پر رسول اللہ کا فرمان ہے۔

"لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔"6

ترجمہ:"وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے"۔

اس حدیث پاک سے یہ اصول مترشح ہوتا ہے کہ اگر کوئی موت کی مرض میں مبتلا ہو اور اس حالت میں اپنے کسی مخصوص وارث کے لیے وصیت کرنا چاہے تو وہ شرعی طور پر نافذ نہ ہو گی کیونکہ اس میں غیر جانبداری کے احتمال کا فقدان پایا جاتا ہے اسی اصول کے پیش نظر مشکوک یا غیر واضح اقرار بھی قابل قبول نہیں سمجھا جاتا ہے۔

قانون اسلامی میں شہادت کا معنیٰ و مفہوم:

شہادت عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ (ش۔ھ۔د) ہے اردو زبان میں اس لفظ کے لیے گواہی اور انگریزی میں اس کے لیے (evidence) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

"علم لغت کی رو سے اس مادہ (ش۔ھ۔د) کثیر المعانی مفاہیم پر محیط ہے تاہم اس کے تین بنیادی اطلاقات نمایاں ہیں۔ حضور والوجود، المعاینۃ والرؤیۃ اور الاستشہاد۔ اسی لغوی اساس سے مشتق لفظ شاہد اصطلاحی اعتبار سے اسم فاعل ہے جس کا مصدر شہادت ہے"۔3

عبد المالک عرفانی کے مطابق!

"شریعت میں شہادت کا استعمال قانونی مضامین میں ہوتا ہے چنانچہ وہ ایک ایسے حتمی اور ناطق بیان سے تعبیر کرتے ہیں جو کسی عدالت میں پیش ہو کر کسی دعوے کو شرعی و قانونی طور پر ثابت کرنے کا باعث بنتا ہے"۔4

شہادت کی قبولیت کی شرائط:

اسلام نے جو قانونی نظام امت مسلمہ کو دیا اسے دیگر تمام قانونی نظاموں پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ اس نے کسی بھی مقدمے میں کم از کم کتنے گواہ ہونے چاہئیں اس کا تعین بھی کر دیا ہے تاکہ انصاف کے قیام میں کسی بھی قسم کا ابہام یا دشواری پیدا نہ ہو بلکہ جو شخص گواہی دے رہا ہو اس کے اوصاف بھی بیان کر دیے تاکہ جھوٹی گواہی کی حوصلہ شکنی بھی جائے اور ان تمام راستوں کو بند کیا جائے جو منصف کے راستے میں رکاوٹ کا باعث ہوں۔

درستگی کے اصول:

1۔ کلمہ گو ہو۔ فقہی نقطہ نظر سے عبادات کے باب میں گواہ کا مسلمان ہونا ایک لازمی شرط ہے اس مسلمہ قانونی اصول کی بنیاد احادیث پر ہے چنانچہ روایت میں ہے۔

"أَتَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ:فَصُمْ رَمَضَانَ۔"[5]

ترجمہ:"کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ ایک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اس نے کہا جی تو آپ نے فرمایا پھر روزہ رکھیں"۔

2۔ اہلیت شہادت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول گواہ کا عادل ہونا ہے۔ کتاب اللہ میں ارشاد ہے۔

"وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ۔"

ترجمہ: "اور اپنے میں سے دو عادل (منصف و معتبر) آدمیوں کو گواہ بناؤ۔"10

شرعاً عادل اس فرد کو تسلیم کیا جاتا جس کا عمومی کردار صالح ہو۔

3۔ خبر متواتر چونکہ حتمی اور یقینی علم کا فائدہ دیتی ہے اس لیے اس سے متصادم کوئی بھی استدلال قانونی و شرعی حثیت میں باطل ہو گا۔

4۔ گواہی کا مقصد کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو۔

5۔ گواہ کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر باشعور ہونا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ خائن، بد کردار، دشمن، کاذب اور اپنی ذات کے لیے بھی گواہی دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

یمین / حلف:

یمین عربی زبان کا لفظ ہے جس کی جمع ایمان آتی ہے لغت میں اس کے معانی دایاں ہاتھ، طاقت اور قسم کے ہیں۔

"امام فیروز الدین کے مطابق یمین کے معنی قسم، حلف، عہد و پیمان پورا کرنا، وعدہ نبھانا اور قول دینے کے ہیں۔ اہل عرب کے ہاں اس لفظ کا اطلاق داہنے ہاتھ پر ہوتا ہے اور وہ کسی بھی معاہدے کے وقت دائیں ہاتھ کو ایک دوسرے پر مارتے تھے اس لیے یہ لفظ قسم کے لیے مستعمل ہو گیا"۔5

"شرعی اصطلاح میں قسم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول کے نام کا ذکر کر کے اپنے کسی قول ، فیصلے یا حکم کو مضبوط یا مؤکد بنایا جائے"۔[6]

قسم کا شرعی تصور:

کسی بھی مقدمے کے دوران اگر مدعی اپنے مؤقف کے حق میں گواہ یا ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہے تو مدعاعلیہ سے قسم لی جاتی ہے اسے اللہ کا خوف اور اخروی یاد دلائی جاتی ہے تاکہ وہ قاضی کے روبرو صرف صدق کا اظہار کرے۔ اس قانونی و شرعی اصول کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

"مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللَّهِ فَقَدْ أَشْرَكَ۔"13

ترجمہ: "جس انسان نے اللہ کے سوا کسی اور ذات یا چیز کی قسم کھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا"۔

یہی مضمون کی دوسرے مقام پر ہے جس میں ارشاد ہے۔

"احْلِفْ بِاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ مَا لَهُ عِنْدَكَ شَيْءٌ"

ترجمہ: "اس اللہ کی قسم اٹھاؤ جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم پر مدعی کا کوئی حق واجب نہیں ہے"[7]۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدمہ میں مدعاعلیہ سے قسم لی اور قسم کھا لینے کے بعد مدعی کے لیے مزید عدالتی کاروائی کا کوئی جواز نہیں رہتا لہذا مقدمہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ لعان میں بھی قسم کا عنصر موجود ہوتا ہے لیکن اس کا طریقہ مختلف ہے اس میں شوہر چار بار قسم کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتا ہے اور پانچویں مرتبہ وہ کہتا ہے کہ اگر میرا یہ بیان جھوٹ پر مبنی ہے تو مجھ پر اللہ کی پھٹکار ہو چونکہ قسم محض ایک اقرار نہیں اس میں شہادت کا عنصر بھی لازمی طور پر شامل ہوتا ہے اس لیے جھوٹی قسم سے سختی سے منع کیا گیا ہے بلکہ اسے شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرائن کا تعارف:

قرائن لفظ قرینہ کی جمع ہے اس سے مراد وہ بیرانی شواہد ہیں جو کسی دعوے کو ثابت کرنے میں فیصلہ کے وقت قاضی کی معاونت کرتے ہیں قانونی و عقلی طور پر قرینہ ایسے بالواسطہ دلائل کو کہتے ہیں جو انسانی ذہن کو حقیقت واقعہ کی اصل سمت کی طرف مائل کرتے ہیں مثال کے طور پر اگر کوئی شخص باقاعدگی سے مسجد میں نماز ادا کرتے پایا جائے تو یاس کی مستقل حاضری اس بات کا مضبوط قرینہ ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس توحید کا قائل ہے۔

قرائن کا حکم:

قرائن کسی واقعے کے بارے میں پوشیدہ اشارے اور علامات ہوتے ہیں جن کی مدد سے حقیقت تک رسائی حاصل کی جاتی ہے بعض اوقات قرائن خود مکمل ثبوت ہوتے ہیں جبکہ بعض مواقعوں پر یہ مقدمے کے حل تک پہنچنے کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں قرائن کی حجیت ہونے کے بارے میں فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے ایک گروہ انہیں معتبر مانتا ہے جبکہ دوسرا اس رائے سے متفق نہیں ہے لیکن ہمارے فقہی ذخیرے میں قرائن کے استعمال کے بے شمار شواہد موجود ہیں جن کو دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ قدیم قرائن

2۔ جدید قرائن

قدیم قرائن:

قرائنی شہادت کی حجیت اور قانونی قبولیت کے معاملے میں فقہاء کے مابین دو بنیادی آراء پائی جاتی ہیں ایک گروہ اس کی اثباتی حثیت کا قائل ہے جبکہ دوسرا اس کا منکر ہے تاہم عدالتی تعطل اور تضیع حقوق کے سد باب کے لیے قرائن کا قضائی استعمال ناگزیر ہے علامتی قوت کے اعتبار سے قرائن کی دو اصولی اقسام ہیں قرائن قاطعہ جو اتنے واضح اور حتمی ہوتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں مزید کسی دلیل یا جرح کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور قرائن ظنیہ جو

مبہم اور محتاج تاویل ہوتے ہیں جن میں ماہرین فن کی صوابدید درکار ہوتی ہے اسی علمی تناظر میں کلاسیکی فقہاء کے ہاں روایتی قرائن کے ذیل میں درج ذیل امور کا استنباط ملتا ہے۔

1۔ قیافہ

2۔ قسامہ

3۔ قرعہ

یہ تینوں قرائن اسلام کے ابتدائی دور میں عدالتی کاروائیوں کا اہم حصہ تھے اور بہت سارے عدالتی مقدمات میں تفتیش اور حتمی فیصلہ کے لیے ان پر بھروسہ کیا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ دور میں سائنسی اور تکنیکی ترقی نے قرائن کی افادیت اور حدود میں یکسر تبدیلی کر دی ہے جس باعث آج کے جدید دور میں بے شمار سائنسی اور خارجی شواہد موجود ہیں جنہیں عدالتیں درست اور غیر مبہم فیصلہ سازی کے لیے مضبوط بنیاد کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔

جدید قرائن کا تعارف اور حکم:

موجودہ دور غیر معمولی سائنسی و تکنیکی ترقی کا دور ہے جہاں انسانی فہم اور ایجادات نے فکر و عمل کے نئے افق وا کیے ہیں اسی سائنسی انقلاب کا ایک اہم مظہر جدید قرائن ہیں جنہیں معاصر قانونی و سائنسی اصطلاح میں فرنزک سائنس کا نام دیا جاتا ہے۔ فرنزک سائنس دراصل ایک ایسا کثیر الجہتی شعبہ ہے جو مجرسراغ رسانی، شواہد کے کیمیائی و حیاتیاتی تجزیے اور تکنیکی رپورٹس کی مدد سے حقائق کو آشکار کرتا ہے یہ علم جرائم کی مادی کڑیوں کو جوڑ کر ایسی غیر مبہم اور حتمی آراء فراہم کرتا ہے جو عدالتوں کو مقدمے میں منصفانہ اور منطقی انجام تک پہنچنے میں کلیدی معاونت فراہم کرتا ہے۔

فرانزک سائنس کا تعارف اور ارتقاء:

ایسا علم جس میں سائنسی اصولوں اور جدید تکنیکوں کو جرائم کی تفتیش اور عدالتی کاروائی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ترقی نے جرائم کی تحقیقات کو زیادہ مؤثر اور قابل اعتماد بنا دیا ہے جس کے ذریعے شواہد کا تجزیہ کر کے حقائق تک پہنچنا پہلے کی نسبت کہیں آسان ہو گیا ہے۔ فرانزک کا لفظ لاطینی زبان کے (Forensis) سے نکلا ہے جس کا مطلب عدالت کے سامنے ہے اس علم کی ابتدائی جھلک قدیم رومی دور میں ملتی ہے تاریخی روایات کے مطابق یونانی سائنسدان ارشمیدس نے سونے کے تاج میں ملاوٹ ثابت کرنے کے لیے سائنسی طریقہ اختیار کیا جو فرنزاک سوچ کی ابتدائی مثال سمجھی جاتی ہے اس علم کی پہلی باقاعدہ تحریری مثال 1247ء میں چینی عالم سنگ سی کی

کتاب میں ملتی ہے جس میں موت کی وجوہات معلوم کرنے اور حشرات کی مدد سے قاتل کی شناخت جیسے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے بعد ازاں یعرپ میں متعدد ماہرین طب نے زہر، تشدد اور غیر طبعی اموات کی تحقیقات کے اصول وضع کیے جس سے اس علم کو مزید ترقی ملی۔ وقت کے ساتھ اس علم نے جدید شکل اختیار کر لی اور آج اس میں ڈی این اے، بشریات، آثار قدیمہاور حشریات سمیت کئی شعبے شامل ہیں اگرچہ جدید جرائم نے تفتیشی چیلنجز میں اضافہ کیا ہے تاہم نئی سائنسی تحقیقات نے شواہد کی جانچ کے زیادہ مؤثر طریقے بھی متعارف کروائے ہیں۔

جدید قرائن کی شرعی اور قانونی حیثیت:

جدید سائنسی شواہد (ڈی این اے، فنگر پرنٹ، الیکٹرانک ریکارڈنگ، اور دیگر وغیرہ) قانون وشریعت دونوں کی نظر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات میں یہ شواہد تو مضبوط اور قابل قبول دلائل کے طور پر استعمال کیے جاسکتے ہیں تاہم حدود وقصاص کے معاملات میں ان کی حثیت گواہوں یا شرعی اقرار کے متبادل کی نہیں بلکہ انہیں ایک مضبوط قرینہ تصور کیا جاتا ہے اگرچہ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان بعض اختلاف پائے جاتے ہیں مگر معاصر فقہی تحقیقات اور بین الاقوامی فقہی اداروں نے جدید سائنسی قرائن کی افادیت کو تسلیم کیا ہے ہے۔

"مجمع الفقہ الاسلامی کے مطابق ڈی این اے نسب کے اثبات میں قطعی دلیل نہیں تاہم اسے ایک مضبوط قرینہ قرار دیا گیا ہے جبکہ زنا، قتل سے متعلق تحقیقات اور گمشدہ بچوں کی شناخت جیسے معاملات میں اس سے استفادہ کیا گیا ہے"۔8

دارالافتاء مصر کا فتویٰ ہے!

"ان کی رائے میں فنگر پرنٹس اور ڈی این اے ایسے مضبوط سائنسی قرائن ہیں جنہیں عدالتی فیصلوں میں معتبر حیثیت حاصل ہے"۔9

مجموعی طور پر جدید فقہی آراء اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ جدید قرائن قانونی اور شرعی تحقیقات میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ان کی بنیاد پر فیصلے بھی کیے جاسکتے ہیں۔

فقہاء کا نقطہ نظر:

"احناف بالخصوص قسامہ اور لوث کے معاملات میں قرائن کو ذریعہ اثبات تصور کرتے ہیں"۔10

"مالکی فقہ میں قوی قرائن کو مستقل دلیل مانا جاتا ہے اور بعض حالات میں انہیں حدود کے معاملات میں قابل اعتبار سمجھتے ہیں"۔11

"شوافع حضرات قرائن کو بنیادی دلیل کے بجائے معاون ثبوت مانتے ہیں لیکن جب قرائن قطعی نوعیت کے ہوں تو ان کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی گنجائش کو تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ امام نوویؒ 12 رقم طراز ہیں"۔13

"حنابلہ قرائن کو نمایاں اہمیت دیتے ہیں۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے نزدیک قاضی کے لیے قرائن کی روشنی میں فیصلہ کرنا عدل کے عین تقاضوں کے مطابق ہے"۔14

"معاصر قانونی نظام میں بھی قرائن فیصلہ سازی کا اہم حصہ بن چکے ہیں دنیا کے مختلف ممالک میں نسب ،خاندانی تنازعات اور فوجداری مقدمات میں ان شواہد کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔ مصر کی عائلی عدالت نے 2005ء میں حق نسب کے تنازعات کو حل کرنے کے لیے (فاDNA) پروفائلنگ کو بطور حتمی قرینہ ثبوت تسلیم کیا"۔15

مجموعی طور کلاسیکل و معاصر فقہی مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرائن حقیقت تک رسائی اور دعوے کے اثبات میں معاون کردار ادا کرتے ہیں۔ عصر حاضر میں گواہوں کی عدم دستیابی اور ان کی قابل اعتماد حثیت سے متعلق مسائل کے باعث جدید سائنسی قرائن اور فرنزاک شواہد کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے یہاں تک کہ عدالتی تحقیقات کا بڑا حصہ انہی پر منحصر ہو چکا ہے۔

قرائن کی حجیت پر مبنی عدالتی نظائر:

صدر اسلام بالخصوص عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں عدالتی معاملات میں تصفیے کے لیے قرائن سے استدلال کیا جاتا تھا انصاف کے مؤثر قیام اور حقائق تک رسائی کے لیے متعدد مقدمات میں قرائن کو بنیاد بنا کر فیصلے کیے گئے ذیل میں چند ایسی نمایاں عدالتی نظائر کا ذکر کیا جائے گا جن میں فیصلہ سازی کا انحصار قرائن اور حالات واقعہ پر تھا۔

کفالت وحضانت کے باب میں رسول اللہ کی قضائی نظیر:

"عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قضى بابنةِ حمزةَ لخالتها وقال: الخالَةُ بمنزلةِ الأمِّ."23

" حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ 16 سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ 17 کی صاحبزادی کو اُس کی خالہ (یعنی حضرت جعفرؓ کی بیوی اسماء بنت عمیسؓ) کے سپرد کر دیا اور فرمایا: خالہ ماں کے درجہ میں ہے۔"

غزوہ اُحد کے بعد حضرت حمزہؓ کی بیٹی یتیم ہوئیں تو ان کی کفالت کے لیے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ 18، حضرت زید بن حارثہؓ 19 جو رسول اللہ ﷺ اور حضرت علیؓ نے دعویٰ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ

حضرت جعفرؓ کے حق میں فرمایا کیونکہ بچی کی خالہ (اسماء بنت عمیسؓ) ان کے عقد میں تھیں۔ آپ ﷺ نے عائلی زندگی کا ایک عظیم قانون بیان کرتے ہوئے فرمایا خالہ ماں کے قائم مقام ہے۔

فیصلے کی قرائنی بنیادیں:

قرابت کا قرینہ: خالہ نسبی اعتبار سے بچے کے قریبی ترین رشتہ داروں میں شمار ہوتی ہے اس لیے حضانت میں اس کو دوسروں پر مقدم رکھا گیا۔

شفقت و مصلحت کا قرینہ: یتیم بچی کی پرورش و نگہداشت کے لیے خالہ فطری طور پر زیادہ محبت، مادری شفقت اور توجہ فراہم کر سکتی ہے جو بچے کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

شرعی و فقہی قرینہ: رسول اللہ ﷺ نے یہ اصول جاری کیا کہ حضانت میں خالہ کو ماں کا درجہ حاصل ہے، اور یہی اصول بعد میں فقہائے کرام نے حضانت (custody) کے ابواب میں لیا ہے۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے بچی خالہ کے سپرد کی اور درجہ بالا قرائن کو بنیاد بنایا تاکہ اس کی بہترین نگہداشت ہو سکے اور یہ بھی فرمادیا کہ فقط خالہ ہی ماں جیسی شفقت دے سکتی ہے کوئی اور نہیں۔

راستہ متعین کرنے کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ کا حکم:

"عَن أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَضَى إِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِي الطَّرِيقِ فَجَعَلْتُمْ سَبْعَةَ أَذْرُعٍ"۔ 20

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ جب تم راستے میں اختلاف کرو تو (اس کی چوڑائی) سات ہاتھ مقرر کر دو"۔

"راستے کی تعیین کے حوالے سے جب صحابہ کرام کے درمیان جھگڑا ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ اصولی قاعدہ بیان فرمایا کہ راستے کو چھوڑتے وقت معروف کو سامنے رکھو تاکہ مفاد عامہ اور بالخصوص اس وقت کی ضرورت کو سمجھا جائے لہذا راستہ چھوڑتے وقت کم از کم ساتھ ہاتھ رکھا کرو"۔

فیصلے کے استنباطی عوامل:

عمرانی و معاشرتی تناظر: دور رسالت میں شہروں کا ڈھانچہ منصوبہ بندی کے بغیر روایتی تھا ایسے میں رہائشی علاقوں میں شارع اور راستوں کی حدود واضح نہ ہونے کے باعث اکثر اراضی اور حق شفعہ کے تنازعات جنم لیتے تھے جس کے لیے ایک پائیدار قانونی و عمرانی ضابطے کی ضرورت تھی۔

شارع عام اور نقل و حرکت: نبی کریم ﷺ نے شارع عام کی چوڑائی سات ہاتھ متعین فرمائی اس تحدید کی بنیادی حکمت اور علت یہ تھی کہ اس دور کے مروجہ ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل کا نظام متاثر نہ ہو۔

اجتماعی انصاف اور تحفظ حقوق: شریعت کی رو سے کسی بھی فرد کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی چار دیواری یا تعمیرات کو آگے بڑھا کر دوسروں کے حق راہداری کو غصب کرے۔

عرف مستقر کا قرینہ: فقہی اصول (العادۃ محکمۃ) کے تحت نبوی دور میں راستے کا معیار اونٹ کی آمد و رفت تھا معاصر دور میں اس اصول کی تطبیق حالات کے مطابق ہو گی۔

قانونی و فقہی توجیہ: اسلامی فقہ میں اس جزئیہ کو مصالح عامہ اور سد ذرائع کے اصولوں کے تحت دیکھا گیا ہے۔

اس حکم کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی احکام محض لفظی یا ظاہری نہیں ہوتے بلکہ وہ حالات، عرف، ضرورت اور معاشرتی تقاضوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں اسلامی نظام عدل میں عملی زندگی کے تقاضوں اور اجتماعی مصالح کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

مسئلہ مفقود الخبر شوہر میں حضرت عمر کا قضائی فیصلہ:

"عن يحيى بن سعيد أنه قال:سئل عمر بن الخطاب عن امرأةٍ غاب عنها زوجها، ولا يدرى أين هو؟ فقال عمر بن الخطاب: تنتظر أربع سنين، ثم تعتد أربعة أشهر وعشرا، ثم تحلّ ـ فقال مالك: وذلك الأمر عندنا".[21]

"حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک ایسی مجبور عورت کے بارے سوال کیا گیا جس کا شوہر لاپتہ ہو چکا ہو اور اس کا کوئی سراغ نہ ملتا ہو؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس سماجی مسئلے کے متعلق فرمایا: وہ عورت چار سال تک انتظار کرے اگر اس دوران بھی کچھ معلوم نہ ہو تو وہ چار ماہ دس دن عدت کے گزارے اس کے وہ آزاد ہے کہ جہاں چاہے اپنا دوسرا نکاح کر لے"۔

"امام مالکؒ کے مطابق اس مسئلے میں ان کی رائے بھی یہی ہے۔"

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس اس شوہر کا مسئلہ لایا گیا جو لاپتہ ہو گیا تھا تو آپ نے بیوی کو چار سال انتظار کرنے کا حکم دیا، اس کے بعد عدتِ وفات 4 ماہ 10 دن گزارے اور پھر اس کے لیے اگلا عقد جائز ہے۔ آپ نے یہ حکم فقط رائے یا ذاتی قیاس پر نہیں، بلکہ متعدد عملی پہلوؤں اور حالات کو پیش نظر رکھا لہذا اس اجتہادی اور عدالتی فیصلے میں فقہی، عرفی اور حالات زمانہ سے متعلق قرائن کو ملحوظ رکھ کر ایک متوازن اور عملی حل پیش کیا"۔

قرائن استنباط :

"عمومی طور پر اس دور میں مدتِ حمل کی تعیین کے بارے میں حضرت عمر کو معلوم تھا کہ وہ کتنی ہو سکتی ہے بعض روایات کے مطابق اس وقت کا عرف اس بات پر مستدل تھا کہ چار سال تک بھی حمل ہو سکتا ہے ۔ حضرت عمر نے شوہر کے زندہ ہونے اور واپس آجانے کے امکان کو بھی مد نظر رکھا اور اگر اس کی موت واقع ہو چکی ہو مگر عورت کو خبر نہ ہو اس لئے عورت اپنے آپ کو چار سال روکے رکھے"۔22

"چار سال کی مدت اس لئے کہ اگر اس سے زائد مدت رکھی جائے تو یہ عورت پر ظلم ہو گا جبکہ غالب گمان اس بات پر ہو کہ شوہر مر چکا ہے تو فقط بیوہ کی عدت واجب ہو گی۔ اگر عورت کو تاحیات منتظر چھوڑا جائے تو عدم تعلیق لازم آئے گی جو شریعت کے مزاج کے خلاف ہے"۔23

"حضرت عمر نے اس مسئلے میں عدت وفات والے قرآنی حکم کو بطور قرینہ واستدلال بنیاد بنایا کیونکہ مفقود الخبر شوہر کو بعض حالات میں حکمامیت کے قائم مقام سمجھا جاسکتا ہے"۔24

مزید بر آں اگر اس مسئلے کو غیر معین انتظار پر چھوڑ دیا جائے تو ہر عدالتی نظام میں بے شمار پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور ہر عورت کو مسلسل عدالتوں سے رجوع کرنا پڑے گا یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عثمان، علی، زید بن ثابت، معاذ بن جبل وغیرہ سے بھی اس نوعیت کی آراء منقول ہیں اور کسی معروف اختلاف کا ذکر نہیں ملتا جو اجماع سکوتی کو ظاہر کرتا ہے۔

اسلامی قانون میں شرب خمر کی مقررہ حد:

"عن زيد بن أسلم، عن أبيه قال: كنا في زمان عمر بن الخطاب إذا أخذنا بالرجل قد شرب الخمر فاعترف أو شهد عليه شاهدان، أمر به عمر فَضُرِبَ أربعين سوطاً. فإذا تتابعوا في ذلك قال عمر: قد تتابع الناس في شرب الخمر، وزاد في الحد ثمانين".25

"حضرت زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں جب ہم کسی آدمی کو شراب پیتے ہوئے پکڑتے اور وہ خود بھی اعتراف کر لیتا یا اس پر دو گواہ گواہی دیتے، تو حضرت عمرؓ کے حکم سے اسے چالیس کوڑے مارے جاتے۔ پس جب لوگ کثرت سے شراب پینے لگے تب حضرت عمرؓ نے فرمایا: تحقیق زیادہ تر لوگ شراب پینے لگے ہیں لہٰذا آپؓ نے حد کو بڑھا کر اسی کوڑے کر دیا۔"

خلافت عمر میں بھی شراب نوشی کی حد چالیس کوڑے تھی جو عہد نبوی و صدیق میں تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ جب جرم میں اضافہ اور معاشرے میں کثرت ظاہر ہونے لگی تو آپ نے حالات اور قرائن واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے از سر نو غور فرمایا اور سزا دوگنی کر دی۔

دلیل کی بنیاد بننے والے قرائن:

"سیدنا عمرؓ نے عدالتی معاملات میں ہمیشہ مسلمہ فقہی قاعدے "البينة على المدعي" کے تحت فیصلے کیے یعنی ی اس اصول کے تحت سزا کا انحصار یا تو مجرم کے اعتراف جرم کی بنیاد پر ہوتا تھا یا دو عادل گواہوں کی شہادت پر۔ جب معاشرے میں شراب نوشی کی پھیل رہی تھی اور اخلاقی بگاڑ بڑھ رہا تھا تو آپ نے اس برائی کے خاتمے کے پیش نظر حد خمر میں اضافہ کر کے اسے اسی کوڑے مقرر کر دیا۔ یہ فیصلہ آپ کی ذاتی رائے پر مبنی نہ تھا بلکہ آپ نے سیدنا علی المرتضیٰ اور دیگر صحابہ کرام سے مشاورت کے بعد معاشرتی تباہی کو روکنے کے لیے یہ قدم اٹھایا"۔26

شریعت اسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم ترین مقصد عقل کی حفاظت ہے۔ چونکہ شراب انسانی دماغ کو ماؤف کر کے اسے شعور سے عاری کر دیتی ہے، اس لیے حضرت عمرؓ نے سزا میں اضافہ کر کے اسلامی شریعت کے اس عظیم مقصد کو مزید مستحکم اور محفوظ بنایا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے اپنے فیصلوں میں محض ذاتی رائے کو بنیاد نہیں بنایا بلکہ اعتراف، شہادت، سماجی قرائن اور مصلحت عامہ کو پیش نظر رکھا ان ہی اصولوں کی روشنی میں آپ نے مختلف احکام اور سزاؤں کا تعین فرمایا جو اس بات کی مضبوط دلیل ہے کہ شرعی قانون میں قرائن کو اہم اور مؤثر حثیت حاصل ہے۔

لاپتہ شخص کی وراثت:

عَن عُبَيْدَةَ السَّلْمَانِيِّ قَالَ:قَضَى عُثْمَانُ فِي الْمَفْقُودِ أَنَّهُ إِذَا مَضَى أَرْبَعُ سِنِينَ قُسِمَ مَالُهُ بَيْنَ وَرَثَتِهِ.27

"حضرت عثمان غنیؓ نے گمشدہ شخص کے بارے میں فیصلہ فرمایا کہ اگر اس پر چار سال گزر جائیں تو پھر اس کا ترکہ اس کے ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔"

"عَنِ ابْنِ شُبْرُمَةَ قَالَ:كَانَ عُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ يَقُولُونَ فِي الْمَفْقُودِ: يُنْتَظَرُ بِهِ أَرْبَعَ سِنِينَ، فَإِنْ لَمْ يَجِئْ قُسِمَ مَالُهُ بَيْنَ وَرَثَتِهِ".28

"حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ گمشدہ شخص کے بارے میں یہ فرمایا کرتے کہ اس کے لئے چار سال انتظار کیا جائے، پس اگر وہ واپس نہ آئے تو اس کا مال اس کے ورثاء کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔"

روایات کے الفاظ یہ بیان کر رہے ہیں کہ مفقود کا چار سال تک انتظار کیا جائے اگر وہ لوٹ کر نہ آئے تو پھر سارا ترکہ ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا گویا صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کا بھی مؤقف یہ ہے کہ ایسے شخص کی وراثت چار سال کے بعد تقسیم کر دی جائے۔

فیصلے کی استدلالی بنیادیں:

"قدیم زمانے میں ایک لمبی مدت غائب رہنے والے کے متعلق غالب قرینہ موت کا تھا۔ چار سال کی میعاد اجتہادی نقطۂ نظر ہے اس لئے کہ اُس وقت ذرائع ابلاغ اور سراغ رسانی کے شعبوں میں اس قدر ترقی نہیں ہوئی تھی لہذا متعین مدت کے بعد مردہ تصور کیا جاتا تھا۔ مذاہب اربعہ میں اس معاملے میں دو آراء پائی جاتی ہیں ایک یہ ہے کہ موت کا قرینہ معتبر مان کر ہر علاقے کا قاضی از روئے اجتہاد فیصلہ کرے اور چار سال تک انتظار کیا جائے"۔29

"دوسری رائے کے مطابق معروف غالب عمر کا اعتبار کیا جائے گا"۔30

"حضرت عثمانؓ کے فیصلے سے یہ اصول وضع ہوتا ہے جب قرائن موت پر دلالت کریں تو اسے شرعاً مردہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی اصول کی روشنی میں جدید عائلی قوانین میں بھی 7 سال کی مدت رکھی گئی ہے"۔31

شہادتِ کذب پر فیصلہ:

"ألا وقول الزور، ألا وشهادة الزور"۔32

"خبردار! جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی گناہِ کبیرہ ہے"

"إن من أكبر الكبائر الإشراك بالله، وعقوق الوالدين، وقتل النفس، وشهادة الزور"۔33

"کبیرہ گناہوں میں سے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، ناحق قتل کرنا، اور جھوٹی گواہی دینا ہے"

"فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ"۔34

"پس بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات (جھوٹی گواہی) سے بھی بچو۔"

مذکورہ نصوص سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شریعت نے جھوٹی گواہی سے اجتناب پر زور دیا ہے چونکہ یہ عمل انسان کے لیے مہلک اور اسے اخلاقی انحطاط کی طرف لے جاتا ہے جس باعث انسان فسق کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اسی باعث آپ کذاب کی گواہی کو ممنوع قرار دیتے بلکہ ان پر حد بھی نافذ کرتے تھے چنانچہ ابن قدامہ نقل کرتے ہیں:

أن عليا كان يجلد شهود الزور ثمانين جلدة، وسماهم فاسقين۔35

"حضرت علیؓ جھوٹی گواہی دینے والوں کو 80 کوڑے مارتے اور انہیں فاسق قرار دیتے تھے۔"

ابن حزمؒ لکھتے ہیں:

وكان عليٌّ رضي الله عنه يرد شهادة مَن عُرف بالكذب ولو مرّة واحدة.36

"حضرت علیؓ اس شخص کی گواہی رد فرمادیتے جو جھوٹ میں ایک بار بھی مشہور ہو جاتا۔"

حضرت علی کے دور خلافت میں ایک جھوٹا شخص بطور گواہ پیش ہوا تو آپ نے نہ صرف اسے مسترد کیا بلکہ عدالت سے نکال کر سخت انداز میں زجر و توبیخ بھی کی تھی۔

استنباط حکم کے قرائن:

حضرت علیؓ کا عدالتی طرز عمل اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک گواہی تب معتبر ہوتی جب وہ قرائن اور واقعہ سے ہم آہنگ ہوتی ورنہ وہ اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے جبکہ جھوٹی گواہی پر سخت انداز اپناتے ہوئے اسے حد قذف کے برابر سمجھتے اور اس پر کاروائی بھی کرتے تھے۔

ثبوت نسب پر فیصلہ

"الْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ، وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ"۔44

"بچہ فراش کا حق ہے اور زانی کے لیے پتھر ہے"

" ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ"۔37

"انہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے"

گویا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ثبوت نسب نکاح پر منحصر ہے یعنی بچہ اسی شخص کا شمار ہو گا عورت جس شخص کی زوجیت میں ہے۔

قرائن سے استدلال:

"کتاب و سنت کو قرائن کے طور پر استعمال کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر عورت نکاح میں ہے اور اس سے زنا ہوا ہے تو مولود نکاح والے شوہر کا ہو گا۔ آپ نے قرینے کے طور پر نسب کی حفاظت کو پیش نظر رکھا۔ اگر ولد الزنا کو زانی کی طرف منسوب کیا جاتا تو معاشرے بگاڑ پیدا ہوتا۔ وراثت کا فساد، محرمات نکاح میں اختلاط، قریبی رشتے حرام تعلقات میں خلط ملط ہو جاتے۔ یہ قرینہ معاشرتی اور شرعی مصلحت کا تھا۔ حضرت علیؓ سیاستِ شرعیہ کے اصول کو قرینے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا ولد الزنا کو وراثت یا زانی

کے نسب سے جوڑنے کا یہ معنی تھا کہ پورے نظامِ معاشرت میں فساد پیدا ہو۔ اس لیے انہوں نے اسے روکنے کے لیے قرائن کا استعمال کیا۔ حضرت علی کا یہ فیصلہ اس قرینے پر مبنی ہے کہ نسب کا نہ ہونا وراثت کے منقطع ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ وراثت ہمیشہ نسب یا نکاح کو مستلزم ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے ولد الزنا کو ماں کی نسبت دی، قرینہ یہ تھا کہ نسب کا کم از کم ایک رخ محفوظ رہے تاکہ وہ قانونی و سماجی اعتبار سے بالکل لاوارث نہ ہو"۔38

"حضرت علیؓ نے ولد الزنا کا جرم اس کا ذاتی نہیں بلکہ والدین کا قرار دیا ہے لہٰذا وہ حدود و قصاص میں عام مسلمانوں کے برابر ہے۔ اس کے مال، عزت اور جان کی حفاظت واجب ہے"۔39

اوپر بیان کردہ فقہی و قانونی نظائر سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلامی قضائی نظام میں قرائن کو محض ضمنی یا تائیدی حیثیت حاصل نہیں بلکہ بعض مقدمات میں انہیں مؤثر اور فیصلہ کن دلیل کے طور پر بھی معتبر مانا گیا ہے۔ ان نظائر سے یہ اصول بھی مستنبط ہوتا ہے کہ براہ راست شہادت کے فقدان میں قرائن احقاق حق کا اہم ذریعہ بن سکتے ہیں لہٰذا فقہی ذخیرہ اور عملی عدالتی روایت دونوں قرائن کی اثباتی اہمیت اور ان کی قانونی حجیت پر دلالت کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام:

انسانی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سبھی تہذیبیں، اقوام اور عدالتی و قانونی نظاموں نے نہ صرف قرائن کو اہمیت دی ہے بلکہ انہیں باقاعدہ اپنے قانونی طریقہ کار کا حصہ بھی بنایا ہے تاکہ ممکنہ نتائج حاصل کیے جا سکیں قدیم و جدید دونوں ادوار میں ان سے استفادہ ناگزیر رہا ہے بلکہ معاصر وضعی قوانین میں قرائن اس قدر مظبوط حثیت اختیار کر چکے ہیں کہ بسا اوقات یہ براہ راست شہادت کا متبادل سمجھے جاتے ہیں چونکہ اسلام نے ایک وسیع، جامع اور ہمہ گیر عدالتی و قانونی نظام متعارف کروایا جس کے اولین مصادر قرآن اور سنت نبوی ہیں جبکہ اجماع، قیاس اور دیگر تمام مصادر و ذرائع ثانوی ہیں لہٰذا فقہاء کرام نے قرائن کو بھی انہی ثانوی دلائل اور وسائل اثبات میں شمار کیا ہے۔ تاہم اسلامی شریعت میں قرائن کی حجیت کو نہ تو مطلق اور غیر محدود قرار دیا گیا اور نہ ہی سرے سے ان کا انکار کیا گیا ہے بلکہ ان کے رد و قبول کے لیے متوازن، معقول اور حقیقت پسندانہ اصول وضع کیے گئے ہیں۔ شرعی طور پر قرینہ اسی وقت قابل حجت ہے جب وہ یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ اس کے ذریعے کشف حقیقت ممکن ہے یہی اعتدال پسند فکر اسلامی نظام قضاء کو دیگر نظاموں سے ممتاز بناتی ہے۔

حواشی

[1] مجلۃ الاحکام العدلیہ، دفعہ، 1627 تا 1630، صفحہ 375، 374

[2] القرآن، 135:04

[3] عبد الحمید بلیاوی، مصباح اللغات، صفحہ 466

[4] عرفانی، عبد المالک، اسلامی قانون شہادت، مکتبہ العلمیہ، اردو بازار لاہور، 2000، صفحہ 17

9 السجستانی، ابو داؤد سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، کتاب الصیام، باب فی شہادۃ الواحد علی رؤیۃ الہلال، حدیث نمبر 1691

12 الفوزان، صالح بن فوزان، الملخص الفقہی، کتاب الآیمان، دار العاصمۃ، ریاض

14 السجستانی، ابو داؤد محمد بن سلیمان، سنن ابی داؤد، کتاب الآقضیہ، باب کیف الیمین، جلد، 3، ص، 310، حدیث نمبر 3254

[8] قرارات مجمع الفقہ الاسلامی، قرار رقم، 2، 94

[9] دار الافتاء المصریہ، فتویٰ نمبر 2005، 2806

[10] ابن ھمام، فتح القدیر، ج 7، ص، 306

[11] القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج، 2، ص، 187

[12] آپ کا پورا نام ابو زکریا محیي الدین یحیی بن شرف بن مری بن حسن الحزامی الحورانی النووی الشافعي ہے۔ ملک سوریہ کے علاقے حوران کے قریہ "نوا" آپ کا مولد و مدفن ہے۔ سن پیدائش 631ھ اور سن وفات 676ھ ہے۔ زیادہ عرصہ دمشق میں رہے۔ تھذیب الأسماء واللغات، المنھاج في شرح صحیح مسلم، ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین آپ کے مشہور تصانیف میں سے ہیں۔۔۔ (الزرکلی، **الاعلام للزرکلی**، بذیل مادہ "النووي")

[13] امام نووی، روضۃ الطالبین، ج 8، ص 240

[14] ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ، ج 35، ص 409

[15] zygojournal.org

[16] آپ کا پورا نام براء بن عازب بن حارث بن عدي بن جشم الخزرجي الانصاري ہے۔ غزوہ بدر میں کم عمری کی بناء پر واپس کر دئے گئے تھے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ جمل اور صفین میں شریک رہے۔ بعد میں کوفہ میں وفات پائی۔۔۔ (ابن عبد البر، **الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب**،، بذیل مادہ 173 "البراء")

[17]

[18] آپ کا نام و نسب أبو عَبْد اللہ جعفر بن أبي طالب عَبْد مناف بن عَبْد المطلب بن ھاشم [بن عَبْد مناف ہے۔ آپ حضرت علی کے بھائی ہیں۔ آپ اس سے دس سال بڑے ہیں۔ مہاجرین اولین میں سے ہیں جنہوں نے حبشہ ہجرت کی۔ غزوۃ مؤتہ میں سن 8

ہجری میں شہید ہوئے۔ جس میں شہید ہو جانے سے پہلے آپؓ کے دونوں ہاتھ کاٹے گئے۔ جس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ہاتھوں کے بدلے آپؓ کو دو پر عطا فرمائے جس سے آپ کا لقب طیار یعنی اڑنے والا پڑ گیا۔۔۔ابن عبد البر، **الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب**، بذیل مادۃ 327 "جعفر بن ابی طالبؓ"

[19] آپ کا نام و نسب زید بن حارثۃ بن شراحیل بن کعب بن عبد العزی بن امرئ القیس ہے۔ اس کو دور جاہلیت میں جبکہ آپ ابھی بچے تھے، باغیوں نے قید کر ڈالا اور پھر ان سے حکیم بن حزام نے خریدا۔ اُن سے خدیجۃ بنت خویلدؓ نے خریدا اور نبی اکرم ﷺ کو ہبہ کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس رہے اور آپ ﷺ نے اُس کو متبنیٰ بنایا۔ بعد میں آیت کے نزول کے بعد زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثۃ بولے جانے لگے۔ غزوۃ موتۃ کے موقع پر سن آٹھ ہجری میں شہید ہو گئے۔۔۔۔۔ ابن عبد البر، **الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب**، بذیل مادۃ 843 "زید بن حارثۃ بن شراحیل الکلبی"

[20] سنن ابی داود، کتاب الأقضیۃ، حدیث: 3639

[21] ۔ الموطأ للإمام مالک، کتاب الطلاق، باب ماجاء في المفقود، حدیث رقم 1561

[22] ۔ المغنی لابن قدامہ، جلد 9، ص 100

[23] ۔ الفقہ علی المذاہب الأربعہ، باب العدۃ، جلد 4

[24] ۔ تفسیر قرطبی، سورہ البقرہ، آیت، 234

[25] ۔ الموطأ، کتاب الحدود، باب حد الخمر، رقم: 1557

[26] ۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، حدیث نمبر، 1706، 1707

[27] ۔ رواہ عبد الرزاق، المصنف، 16467

[28] ۔ البیھقی، السنن الکبری، ج 6، ص 209

[29] ۔ مالک بن أنس، الموطأ، تحقیق: محمد فؤاد عبد الباقی، قاہرہ: دار احیاء التراث العربي، 1985، کتاب الطلاق، باب المفقود۔

[30] ۔ کاسانی، علاء الدین، بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع، بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1982، ج 6، ص 250

[31] ۔ پاکستان مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961، دفعہ 3

[32] ۔ صحیح بخاری (2654)، صحیح مسلم (87)

[33] ۔ صحیح بخاری (5976)، صحیح مسلم (87)

[34] ۔ الحج 22:30

[35] ۔ المغنی، ابن قدامہ، ج 10، ص 171

[36] ۔ المحلی، ابن حزم، ج 9، ص 423

[37] ۔ الأحزاب: 5

[38] المغنی لابن قدامہ، 6/179

[39] ابن القیم، الطرق الحکمیۃ، ص324

مصادر و مراجع

- القرآن الکریم
- ابن القیم، محمد بن ابی بکر۔ (2007). الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ. بیروت: دار الکتب العلمیۃ.
- ابن الہمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد۔ (2003). فتح القدیر. بیروت: دار الفکر.
- ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم۔ (2005). مجموع الفتاویٰ. ریاض: دار عالم الکتب.
- ابن حزم، علی بن احمد۔ (2002). المحلی بالآثار. بیروت: دار الفکر.
- ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ۔ (1992). الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب. بیروت: دار الجیل.
- ابن قدامہ، موفق الدین عبد اللہ بن احمد۔ (2004). المغنی. بیروت: دار الکتب العلمیۃ.
- ابو داود، سلیمان بن الاشعث۔ (2000). سنن ابی داود. بیروت: دار الفکر.
- افریقی، محمد بن مکرم ابن منظور۔ (1994). لسان العرب. بیروت: دار صادر.
- البخاری، محمد بن اسماعیل۔ (2001). الجامع الصحیح. دمشق: دار طوق النجاۃ.
- بلیاوی، عبد الحمید۔ (2008). مصباح اللغات. لاہور: مکتبہ اسلامیہ.
- البیہقی، احمد بن الحسین۔ (2003). السنن الکبریٰ. بیروت: دار الکتب العلمیۃ.
- پاکستان۔ (1961). مسلم فیملی لاز آرڈیننس، 1961. اسلام آباد: حکومت پاکستان.
- دار الافتاء المصریہ۔ (2005). فتویٰ. قاہرہ: دار الافتاء المصریہ.
- الزرکلی، خیر الدین۔ (2002). الأعلام. بیروت: دار العلم للملایین.
- عبد الرزاق، بن ہمام۔ (1983). المصنف. بیروت: المکتب الإسلامي.
- عرفانی، عبد المالک۔ (2000). اسلامی قانون شہادت. لاہور: مکتبہ العلمیہ.
- القرطبی، محمد بن احمد۔ (2006). الجامع لأحکام القرآن. بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ.
- کاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود۔ (1982). بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع. بیروت: دار الکتب العلمیۃ.

- مالک بن انس۔(1985). الموطأ(تحقیق: محمد فؤاد عبد الباقی). قاہرہ: دار احیاء التراث العربي.
- مجلۃ الاحکام العدلیہ۔(1981). ترجمہ: عبد القدوس ہاشمی۔لاہور: محکمہ اوقاف پنجاب.
- مجمع الفقہ الاسلامی۔(2000). قرارات مجمع الفقہ الاسلامی. جدہ: مجمع الفقہ الاسلامی.
- مسلم بن الحجاج۔(2006). صحیح مسلم. بیروت: دار احیاء التراث العربي.
- النووی، یحیٰی بن شرف۔(1991). روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین. بیروت: المکتب الإسلامي.
- Zygo Journal. (2020). Zygo Journal. Retrieved from https://zygojournal.org